بجری میرے پاؤں تلے چیخی' پتے میرے پاؤں تلے چرمرائے۔ یہ آوازیں کسی طور موسیقی سے مشابہ نہیں تھیں۔ میں نے نظر گھما کر سارے پارک کو دیکھا ہمیشہ کی طرح کا ایک منجمد موسم تھا۔ ہر شے اپنی جگہ موجود تھی مگر سارا منظر گویا تھکا تھکا سا تھا۔

یہ وہی پارک ہے' جس نے میرے اندر روشنی کا ایک جھرنا اگل دیا تھا۔ یہیں سے میں نے اپنی ذات کی شناخت پائی تھی۔ یہیں پر مجھے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز پہلی بار سنائی دی تھی۔ اسی کہکشاں پر میری آنکھ میں ستارے اترے تھے۔ میں نے موسموں کے آئینے میں دل کی جولانیوں کا عکس دیکھا تھا۔

یوں آتے جاتے ہوئے اس سجے سنورے لان اور پھولوں سے لدے کنج پر خواہ مخواہ نظر اٹھ جاتی۔ گھر بھی ایسا تھا جیسے کسی نے کبھی خواب میں یہ نقشہ دیکھا ہو۔ میں جب بھی اس گیٹ کے آگے سے گزرا کرتی' دور تک اس گھر کو دیکھتی جاتی۔

ایک دن میں ٹھٹک گئی
وہاں ایک بت ایستادہ تھا

کیا وہ بت تھا۔ گیٹ کو ایک ہاتھ سے تھامے' وہ کھڑا تھا جیسے وہاں کسی نے کوئی مجسمہ گاڑ دیا ہو۔ میں اسے دور سے دیکھتی آئی' نزدیک تک دیکھتی رہی پھر جاتے جاتے بھی مڑ مڑ کر دیکھا' اس میں حرکت پیدا نہ ہوئی۔

بُشریٰ رحمٰن

تیری دوری کے سائے میرے ساتھ ہوں

ہمارے شہر میں بہت جدید قسم کا پارک بنا تھا' جس نے لوگوں کے اندر جاگنگ کرنے کا ایک نیا شعور پیدا کر دیا تھا۔ ان دنوں میں نے ایک ٹریول ایجنسی میں ملازمت کر لی تھی۔ کرسی پر مسلسل بیٹھے رہنے سے میری ریڑھ کی ہڈی کے نچلے مہرے میں درد رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے ہدایت کی کہ میں روزانہ کم از کم پانچ کلو میٹر پیدل چلا کروں' ورنہ نتائج اور بھی سنگین ہو سکتے ہیں' یوں میں نے بھی لوگوں کی دیکھا دیکھی پارک میں جانا شروع کر دیا' پارک یوں تو شہر سے باہر تھا' مگر اس کے ایک کونے کو' فیشن ایبل آبادی کا سرا لگتا تھا۔ اس جاگنگ ٹریک پر بھاگتے ہوئے' ایک خوب صورت سے گھر کا گیٹ' پارک کی دیوار کو لگتا تھا۔

اتنا شاندار مرد میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سارا راستہ میں یہی سوچتی رہی کہ کیا مرد بھی اتنے دلکش ہوتے ہیں کہ بار بار ان کی طرف نگاہ اٹھ جائے۔ ایسا حسن تو اللہ نے عورت کو عطا کیا ہے۔

دوسرے روز میں آئی تو وہیں کھڑا تھا۔ میں نے اسے آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کہ کیا وہ سچ مچ کا آدمی ہے یا کوئی ڈمی ہے۔ شکر ہے دوسرے دن اس نے جوگرز پہنے ہوئے تھے۔ سفید جینز اور سفید ٹی شرٹ میں وہ آسمان سے اتری ہوئی مخلوق لگ رہا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں اس کے قریب پہنچوں' اس نے گیٹ ہاتھوں سے چھوڑ دیا اور دوسرے ٹریک پر جاگنگ کرنے لگا۔ تب بھی میں اسے دور تک دیکھتی گئی اور

سوچتی رہی۔ خوب صورت لڑکیوں کو جب مرد مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں تو وہ دل میں بہت اتراتی ہیں اور اس دیدہ سراہی کو اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہیں۔ پتا نہیں جب وجیہہ و شکیل مردوں کو لڑکیاں یوں دیکھتی ہوں گی تو وہ دل میں کیا سوچتے ہوں گے؟

اس کو روز دیکھنا ایک عادت سی بن گئی۔

اس کے بارے میں سوچنا ایک سوچ ہی بن گئی۔

اس کے گھر کو تعریفی انداز میں دیکھنا نظر کی تمنا سی بن گئی۔

وہ کبھی تو مجسمہ بنا گیٹ کے ساتھ لگا' پارک میں آنے جانے والوں کا نظارہ کر رہا ہوتا۔ کبھی سفید براق کپڑے پہنے' جاگنگ ٹریک پر دوڑ رہا ہوتا کبھی دھیمے دھیمے چلتا ہوا کسی دوست سے باتیں کرتا میرے قریب سے گزر جاتا اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکراتا۔ وہ بڑی اچھی خوشبو استعمال کرتا تھا۔ کبھی مجھے آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ اپنے گھر کے لان میں بیٹھا اخبار پڑھتا نظر آجاتا۔

کسی شخص کا ہر روز نظر آنا کوئی انوکھی بات تو نہ تھی' مگر پتا نہیں اس شخص میں کیا بات تھی۔ مجھ جیسی آئیڈیل پرست لڑکی اسے نظر بھر کر ضرور دیکھتی۔ اس کا سراپا' قدوقامت اس کے نقش و نگار' اس کی آنکھیں جیسے دنیا کو اپنے اندر سموئے بیٹھی ہوں۔ صحت مند چہرہ جس کے اندر سے گلابیاں جھانکا کرتیں۔

اب یوں ہونے لگا کہ وہ بھی مجھے دیکھتا۔

دیکھنا دو قسم کا ہوتا ہے۔

ایک تو ایسے جیسے ہر روز سب لوگ آتے جاتے' اٹھتے بیٹھتے' سفر کرتے' کام کرتے آس پاس دیکھتے رہتے ہیں۔

دوسرا دیکھنا ایسا ہوتا ہے کہ جیسے نظر نے چاہ کی ہو۔

پھر ایسا ہونے لگا کہ وہ مجھے دیکھتا تو دھیرے سے مسکرا دیتا۔ انوکھی مسکراہٹ تھی اس کی۔ ہونٹ تو وا نہ ہوتے مگر آنکھیں مسکرانے لگتیں رخساروں پر تبسم کا نور ابھر آتا۔

یہ بڑی خطرناک مسکراہٹ ہوتی ہے۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ بعض مرد مسکراتے ہیں تو کلیجہ نکال لیتے ہیں۔ پتا نہیں اس نے اس طرح مسکرانا کہاں سے سیکھا تھا' یا شاید یہ مسکراہٹ نسل در نسل چلتی ہوئی اس تک اپنے آپ پہنچ گئی تھی!

میں بھی جواباً" مسکرانے لگی۔

میں جو باغیانہ خیالات کی جانشین بنی پھرتی تھی' مستقل مردوں کی عادات و سکنات کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں جوں جوں غور کرتی توں توں میری دلچسپی بڑھتی جاتی۔

میری کمر کو آرام آگیا تھا' مگر ایک تجسس نے مجھے ہر روز پارک آنے پر اکسائے رکھا۔ مجھے اس کے گیٹ کے آگے سے گزرنا اچھا لگتا' بے اختیار اس کے گھر کے اندر دور تک دیکھنا اچھا لگتا' اس کے گھر کو دیکھ کر یہ سوچنا کہ وہ اندر ہو گا' اور کیسے رہتا ہو گا؟ پھر اس کے کمروں میں گھومنا اور اس سے بھی آگے سوچنا اچھا لگنے لگا۔

ایک بار مجھے شہر سے باہر جانا پڑا۔ میں چار دن پارک میں نہ جا سکی۔ پانچویں دن گئی' تو وہ گیٹ کے ساتھ مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ اسے اس طرح کھڑے دیکھ کر میرا دل پہلی بار زور سے اچھلا' مجھے اپنے دل کی یہ رفتار اجنبی سی لگی۔

وہ گیٹ چھوڑ کر آگے آگیا اور جلدی سے بولا۔

"آپ چار دن نہیں آئیں خیریت؟"

یہ کہہ کر وہ خود کھسیانا سا ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں چلتی رہی گو میں نے اپنی رفتار دھیمی کر لی تھی۔ وہ بھی قدم ملا کے میرے ساتھ چلنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے' آپ دن گنتے رہے ہیں۔" میں نے قدم جما کر کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکا گلابی رنگ چھا گیا' جیسے سورج پر شفق چھا جائے۔ مجھے اس کے چہرے کا یہ رنگ بہت بھایا۔ ایک بہت ہی شرمیلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری' جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

"اصل میں پچھلے ایک سال سے میں آپ کو

باقاعدگی کے ساتھ آتے جاتے دیکھ رہا ہوں کسی کو روز دیکھنے کی عادت سی پڑ جاتی ہے نا۔"

"وہ تو اس کی نظر کو بھی میری طرح عادت سی پڑ گئی تھی۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ' نظر کو بھی نظر سے راہ ہوتی ہے میں اپنی خوشی دبانا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں شہر سے باہر گئی ہوئی تھی۔"

ابھی سلسلۂ کلام آگے چلتا کہ مخالف سمت سے اس کا ایک دوست آکر اس سے بغلگیر ہو گیا۔ میں آگے بڑھ گئی۔

واقعی مجھے اس پارک میں آتے ہوئے ایک برس ہو گیا تھا؟ مجھے تو خیال نہیں آیا۔ اس نے کیوں کر یاد رکھا۔

ایک سال یعنی بارہ مہینے؟ یعنی 365 دن؟ ہم نے ایک دوسرے کو مسلسل دیکھا۔ دیکھ دیکھ کر اور مسکراہٹوں کے تبادلے میں گزار دیا۔

یہ آنکھ جو ہوتی ہے نا؟ یہ بندے کو چور بنا کے چھوڑتی ہے۔ جس طرح وہ مجھے دیکھا کرتا' میرے سارے جسم میں ننھے ننھے جگنو چمکنے لگتے جس طرح وہ مسکراتا' تو کوئی دل کے آس پاس سرخ گلابی پتیاں سی گرا رہا ہو وہ تو چپ ہی رہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کے چہرے کا اک اک نقش شعر بولتا رہتا پتا نہیں اس میں یہ طلسمی طاقت کیسے آئی تھی۔

گونگے کی کیفیت جان لیوا ہوتی ہے۔

گہری چپ مقفل دروازے توڑ دیتی ہے۔

قطرہ قطرہ گرتا پانی پتھر کے جگر میں سوراخ کر دیتا ہے۔

نہ جانے کب' نہ جانے کیسے میں نے اپنے دل کے اندر وہ دیوانگی محسوس کی' جسے چاہت کہتے ہیں۔

چاہت کیا ہوتی ہے؟

اس کو دیکھنے کی آرزو

اس کو چھونے کی تمنا

اس کو پا لینے کا خواب

اک قصور آنکھوں کا تھا' سزا دل کو ملی۔

کاش! اس کے اندر مردوں والا عامیانہ پن ہوتا' نظروں میں ننگی بھوک ہوتی' گفتگو میں ہوس کی چاشنی ہوتی۔ مسکراہٹ میں طلب کے اشارے ہوتے۔ پھر میں اس سے دور بھاگ جاتی۔ بعض مرد ملتے ہی اپنے مدعا کا اشتہار بن جاتے ہیں۔

وہ اتنا پراسرار کیوں تھا۔

جیسے شام کے سنہرے لمحوں میں آہستگی کے ساتھ آسمان کے سرمئی کناروں سے اتر کر خوابوں کی وادی میں بھٹک رہا ہو موسم کی ساری ملاحتیں اس کی ذات کے اندر سمٹ آئی ہوں۔

اور مجھے بھی تو ساری دنیا ایک دم حسین نظر آنے لگی۔

میں جو دل جلوں کی سالار بنی پھرتی تھی۔ مجھے یہ پارک محبت کا ایک معبد نظر آنے لگا۔

درخت ہمہ وقت جھومتے اور مسکراتے سے لگتے' سبز گھاس مخمل کا ٹکڑا لگتی' پھولوں کے مکھڑے روشن روشن لگتے پارک میں ہمہ وقت' چہکتے چلاتے ہوئے بچے قدرت کے حسین پیغامبر لگتے۔ جھیل کا پانی میرے ساتھ باتیں کرتا رہتا۔

میں جب بجری کے اوپر دوڑتی تو میرے پاؤں کے تلے موسیقی بجتی سوکھے پتوں پر چلتی تو کانوں میں جلترنگ کی آواز ابھرتی۔

دونوں طرف آنکھوں نے تکلف کی چلمن اٹھا دی تھی۔

چلمن کیا اٹھی' جذبوں کی حشر سامانیوں نے آفت مچا دی! سیلاب بلا بے پایاں کی طرح' محبت بند چوکھٹوں کے اندر گھس جاتی ہے۔ جو شے ہاتھ لگے بہا لے جاتی ہے۔

ان دنوں میری امی میرے چہرے کو غور سے دیکھا کرتیں۔ کوئی شے تھی جو میرے چہرے کے اندر سے جھانکا کرتی' امی ہی کیا دفتر میں بھی ہر کوئی مجھے دیکھ کر ٹھٹک جاتا۔ یہ محبت کا اعجاز تھا۔ محبت انسان کو ہوشربا بنا دیتی ہے۔ آنکھوں میں ٹھنڈی بجلیاں بھر دیتی ہے۔ رخساروں کو گلاب کر دیتی ہے۔ ہونٹ ایک کیف بھری مسکراہٹ سے لدے رہتے ہیں۔ نہ جانے اتنی چاندنیاں جسم میں کہاں سے آجاتی ہیں۔ دنیا کا ہر نظارہ بدلا بدلا نظر آتا ہے۔ طبیعت ایسی کہ جیسے ہواؤں کے

ساتھ چاند چھونے میں مگن ہیں۔ میں خود شیشہ دیکھ کر حیران ہوا کرتی۔ گو میرا شمار خوب صورت لڑکیوں میں ہوتا تھا مگر حسن کو آفت بنانے کا گر صرف محبت کو آتا ہے، کسی کے دل میں سما جانا گویا وجود کے اندر مے خانے کا کھل جانا ہے۔

ایک دن امی نے مجھ سے کہا۔ "صبح کی سیر سے تمہاری صحت پر بہت اچھا اثر ہوا ہے۔"

"جی امی۔" میں نے لہرا کر کہا۔

"کمر درد کو تو آرام ہے نا؟" امی نے پھر سلیقے سے پوچھا۔

"کب سے امی! میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں۔" یہ کہہ کر میں ٹھٹکی۔

امی کی نگاہ ابھی تک کچھ تلاش کر رہی تھی، کیونکہ اولاد کو پڑھنے والی آنکھ صرف ماں کے پاس ہوتی ہے۔

"تم نے تو اب شام کو بھی جانا شروع کر دیا ہے۔ اب اتنی ورزش کی ضرورت تو نہیں، گرمی شروع ہونے والی ہے۔ زیادہ کمزور نہ ہو جانا۔" امی رسان سے اپنا پیغام وائرلیس پر چھوڑ کر اپنے کام میں مگن ہو گئیں۔

ہاں! میں نے شام کو باقاعدہ جانا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اکثر شام ہی کو نظر آتا تھا اور وہ چاہتا بھی تھا کہ میں شام کو آیا کروں۔ رفتہ رفتہ میں نے معمول ہی شام کا بنا لیا۔ دفتر سے اٹھ کر سیدھی ادھر آجاتی۔ مگر یہ کہ میں پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بڑی لاپروا تھی۔ وہ نظر میں آیا تو میرے ملبوسات کے ڈیزائن اور رنگ بدلنے لگے۔ واہ کیا تبدیلی تھی!

امی نے دھیمے سے کہا تھا کہ گرمی شروع ہونے والی ہے۔ کیا واقعی موسم بدلنے والا تھا؟ میں بڑی حیران ہوئی، کیونکہ میرے اندر تو ایک مہکتا ہوا، مسکراتا ہوا، گل رنگ موسم آکر ٹھہر گیا تھا۔

اندر کا موسم تمنا کا سرتاج ہو، تو باہر کے موسم کا خیال کون کرتا ہے؟ یہ مئی کا مہینہ تھا۔ یہ مہینہ آنے والی گرمی کا اعلان کرتا ہے۔ لوگ ٹھنڈے کپڑے نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ سردی کے جانے پر شکر مند بھی ہوتے ہیں۔ پھر بھی مشتبہ باتیں کرتے ہیں۔ کتنا اچھا مہینہ ہے۔ میں دل میں سوچتی، ٹھنڈی ہوا جب منہ کو چھو کے گزرتی ہے۔ خیال فوراً" کسی کی طرف دوڑتا ہے۔

جون کا مہینہ آگیا۔ ہر سال گرمی آتی ہے۔ ہر سال لوگ ایک جیسے فقرے کہتے ہیں۔ اف توبہ اس دفعہ تو گرمی نے حد کر دی۔ مگر جون کی چلچلاتی دھوپ، مجھے پیار کی حدت میں ڈوبی لگتی۔ پسینہ کیا بہتا، خوشبو کا جھرنا پھوٹ بہتا۔ پسینے کی خوشبو میں، اس کے سانسوں کی خوشبو رچی محسوس ہوتی۔

جولائی، مون سون کی برساتوں کا مہینہ ہے۔ پہلے میں بھی ایسے ہی کہا کرتی تھی۔ توبہ اس شہر میں برساتوں کے بعد کتنی گندگی ابھر آتی ہے۔ مگر اب کے جب سیاہ کالے بادل آسمان پر چھائے کبھی ہلکا اور کبھی چھاجوں مینہ برسا تو اندازہ ہوا خوابوں کی صورت گری کے لیے برسات کی رم جھم کتنی ضروری ہے۔

سچی بات ہے اگست کا مہینہ مجھے اچھا نہیں لگتا کیونکہ برسات کا سارا حبس اگست کے مہینے میں آجاتا ہے۔ مگر مجھے حیرت تھی کہ مجھے ایک روز بھی حبس یا گھٹن کا احساس نہیں ہوا۔

جب ساون بھادوں کے بعد چبھتی سی دھوپ نکلی تو میرے من کے اندر اتنی ٹھنڈ تھی کہ میں اپنے کام کرنے میں توانائی محسوس کرتی رہی۔

گرمی کی شدتوں کو پار کر کے ستمبر کا مہینہ آتا ہے، گویا دو موسموں کے درمیان ایک پڑاؤ ہے۔ پتا نہیں ستمبر کی شامیں مجھے اداس کیوں لگا کرتی تھیں۔ شام کے پرندے بھی تھکے تھکے سے لگتے تھے، مگر پہلی دفعہ میں نے محسوس کیا کہ ستمبر، موسم میں ایک غیر محسوس تبدیلی کس طرح سے لاتا ہے، ورنہ شدید تپش کے بعد شدید سردی، لوگ کیسے برداشت کر پاتے۔ دنوں کو شاموں کے قریب لانے والا مہینہ ستمبر ہے۔

پھر، میں نے اکتوبر کے مہینے کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ایک دنیا، اکتوبر کو "لورز ویدر" کہتی ہے۔ میں اکثر حیران ہوتی تھی کہ اکتوبر عاشقوں کا مہینہ

کیوں کر ہو گیا۔ اس بار جب اکتوبر آیا تو میں نے موسم کی ملاحتیں محسوس کیں۔ اس کی صبحیں معصوم بچے کے مقدس چہرے کی طرح ہوتی ہیں کہ دیکھتے ہی بے اختیار چوم لینے کو دل چاہے۔ اس کی دوپہریں نہ گرم نہ سرد لڑکپن کی طرح بے پروا بے تکان اس کی شامیں اف اس کی شامیں بہت ظالم ہوتی ہیں۔ دوشیزگی کے الھڑ خوابوں کی مانند تھوڑی تھوڑی خنک، تھوڑی تھوڑی، چنچل ٹھہر ٹھہر کے چلتی ہوئی ہوا اپنے آپ گلے سے لپٹتی رہتی ہے۔ فضا سہیلی بنی کان میں نشیلے قصے کہتی رہتی ہے۔ دل میں سوئی ہوئی وصل کی تمنا سرکشی سے سر اٹھاتی ہے۔ بس ہر سمت ہر آن، محبوب کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ میں نے اکتوبر کا مہینہ بہت مشکل سے گزارا تو یہ!

دل کو قابو میں رکھنا کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ دل تو ساری کائنات میں بس ایک ہی منظر دیکھنا چاہتا تھا، میں نے اس مہینے میں تحفوں کے ذریعے دیوانگی کی حرکتیں بھی بہت کیں۔

نومبر آگیا۔ اپنے کاندھوں پر میٹھی میٹھی سردی لے کر، دھوپ سے گزرتے تو دھوپ بری نہ لگتی، چھاؤں میں بیٹھتے تو چھاؤں تنگ نہ کرتی۔ اس مہینے میں جوانی کو گرم کپڑوں کی ضرورت نہیں ہوتی، گلابی گلابی شاموں میں جوانی اپنے ہی جسم کی آگ تاپا کرتی ہے۔ کبھی کبھی زکام ہو جاتا ہے۔ عشق کے موسم میں زکام جیسی بیماری کتنی رومانٹک لگتی ہے کہ نیم وا آنکھیں ایک اور ہی نشے میں ڈوبی رہتی ہیں۔

دسمبر شدید سردی کا موسم ہے۔ ساری آگ رضائی کے اندر آجاتی ہے عجیب ہے یہ رضائی بھی، گویا رضائی نہیں اوڑھی، خواب اوڑھ لیے ہیں۔

مجھے اس بات پہ غصہ آیا کرتا تھا کہ لوگ جنوری میں نیا سال کیوں مناتے ہیں۔ مگر اب کے جو اس نے پھولوں کا بڑا گلدستہ اور ایک انتہائی دلکش کارڈ مجھے دیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ دنیا میں نیا سال پہلی دفعہ آیا ہے۔ پارک میں علی الصبح کہرا پھیل جاتا۔ اس کہرے میں سے گزر کر جانا، کہرے کے اندھے دھوئیں کو اپنے چہرے پر محسوس کرنا، اس کے گیٹ کے پاس جا کر اسے دیکھنا اور واپسی پر چہرے پر ننھی ننھی بوندیں لے کر واپس آنا، کتنا زندگی بخش کھیل تھا۔

فروری میں برساتیں ہوا کرتی ہیں۔ میں جب کالج میں پڑھتی تھی تو اکثر سوچتی کہ بھلا اتنی شدید سردیوں میں بارشوں کی کیا ضرورت ہے؟ صبح اٹھنا محال۔ کالج جانا مشکل، بازار میں جانا محال، کیچڑ ہی کیچڑ سر راہ بکھرا ہوا مگر اس مرتبہ میں نے ساری ساری رات جاگ کر برساتوں کی جھانجھن کو سنا۔ شب کے پچھلے پہر جب بادل گرجتا ہے اور کہتا ہے میں آ رہا ہوں، تو بجلی کی کڑک اسے راہ دکھاتی ہے۔ پھر یکلخت، جھن جھن کی آوازوں کے ساتھ آسمان سے موتی زمین پر گرنے لگتے ہیں۔ یہ موتی گھروں کے بند دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑتے ہیں تو برہا کی ماری کسی جوگن کے سارے گیت جاگنے لگتے ہیں سناٹے میں بارش کی آواز۔ اس آواز کے ساتھ زمزمے گاتی اپنے دل کی آواز۔ اسی موسم میں برفانی ہوائیں چلتی ہیں جن کی آنکھیں محبت چھین لیتی ہے۔ اسی لیے وہ دیوانہ وار ہر دروازہ، ہر روزن بجاتی گزرتی ہیں کہ جانے ان کا محبوب کس در کے اندر محو خواب ہے یا شاید میں ان ہواؤں کے ساتھ باؤلی ہوئی پھرتی تھی۔

یوں مارچ کا مہینہ آگیا۔ یہ بڑا روشن اور چمک دار مہینہ ہوتا ہے۔ لڑتی جھگڑتی ہواؤں اور برف کے ظالم تودوں میں صلح کروا دیتا ہے۔ خزاں کے ستم سے برہنہ درختوں اور جلے ہوئے پودوں کو نوید زندگی دینے لگتا ہے۔ بڑا عجیب موسم دیکھا میں نے، جنوری اور فروری میں ایک پت جھڑ کا موسم گزرا تھا۔ پتے نیم مردہ حالت میں زمین پر گر کر ڈھیر ہوتے جا رہے تھے۔ ہواؤں کے رنگ زرد تھے۔ موسم مٹیالا ہو گیا تھا۔ صریحاً "وہ ہجر کا موسم تھا، مگر جس دل پر ایک عرصہ سے ہجر کے آرے چل رہے ہوں، اسے تو وہ موسم بہت بھائے گا۔ پت جھڑ تو پارک کے اندر بھی تھی، مگر اداسی کہیں نہیں تھی۔ میری آنکھیں مصور کی ہو گئی تھیں۔ ٹنڈ منڈ درختوں میں دل اٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کو دیکھ لینا نظر کی معراج جو تھی، پر یہ سارا منظر نامہ مارچ نے آ کر بدل دیا۔

بہار تو ہر سال ہی آتی تھی۔ ہمارا شہر پھولوں سے بھر جاتا تھا۔ پھولوں کو دیکھ کر دل میں یوں بھی ترنگ اٹھتی ہے، لیکن اس مارچ میں ہر پھول میری جوانی کی شبیہہ بنا کھڑا تھا۔ ہر پھول کی خوشبو میں میری سانسوں کی مہک رچ بس گئی تھی۔ اس کا لان گلاب کے پھولوں سے لدا کھڑا تھا۔ وہ پھول وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے سلام کرتے تھے۔

اپریل ایک چور مہینہ ہے۔ بہار کی باقیات کو چرا کر رکھ لیتا ہے اور ہمیشہ مسکراتا لہلہاتا نظر آتا ہے۔ سال کے بارہ مہینے گویا میرے دل سے ہو کر گزر رہے تھے اور تو اور میں نے ان مہینوں کی چاند راتوں کو باقاعدہ محسوس کیا تھا۔ پھر تو یوں ہونے لگا کہ چودھویں کی رات مجھ پر ایک ہذیانی، جنونی کیفیت طاری کر دیتی۔ میں گھر سے بہانہ بنا کر نوکر کو ساتھ لے کر نکلتی، اسے گیٹ پر چھوڑتی اور دوڑ کر اس کے گھر کے آگے آ جاتی۔ میں نے اسے کہہ رکھا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو چاند کی چودھویں میں اپنے لان میں کھڑا ہوا نظر آئے۔ وہ ایسا ہی کرتا۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ، چودھویں کی رات، کچھ لوگوں کو دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں۔ یہ دیوانگی نہیں تو کیا تھا کہ بس دوڑتے ہوئے آنا۔ ایک سایا سا چاند کے طبق کے نیچے دیکھنا اور پھر لوٹ جانا۔ اف کوئی طاقت تھی، کوئی توانائی تھی کہ میں اڑتی پھرتی تھی، پھلانگتی پھرتی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوتا کہ محبت دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور چیز ہے، کبھی تو کچے گھڑے کو کشتی بنا دیتی ہے۔ ریگستانوں میں راستہ تلاش کرنا سکھاتی ہے۔ ایٹم بم، ٹینک، بارود، میزائل کوئی شے محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بہت ہنسا کرتی تھی۔ میں، یہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی فلمیں دیکھ کر، اکثر سہیلیوں سے کہا کرتی، ""اگر یہ ظالم سماج ایک دن لیلیٰ مجنوں کی شادی کر کے انہیں ایک کمرے میں بند کر دیتا تو ایک ماہ کے بعد ان کی طلاق کی نوبت آ جاتی۔ سب بکواس ہے عشق و محبت!""

اب مجھے اپنے خیالات پر افسوس ہوتا۔ محبت تو ایک عرفان میں ڈوبی بے خودی ہے۔ ران کے گوشت کے کباب بنوا سکتی ہے۔ ایک کو مار پڑے تو دوسرے کے جسم پر داغ پڑ سکتے ہیں۔ یہی جنگیں لڑواتی ہے قتل و غارت کرواتی ہے۔ عجیب ملکوتی جذبہ ہے۔

مجھے دنیا بھر کے شاعروں، ادیبوں پر ٹوٹ کر پیار آتا، جن کی میں ہمیشہ ہنسی اڑاتی تھی۔ اب ان کا ہر شعر مجھے اپنے دل کی ترجمانی کرتا محسوس ہوتا۔ ہر کہانی کی ہیروئن میں بن جاتی۔ جن فلموں کا میں مذاق اڑایا کرتی تھی، ان فلموں کو دیکھ کر میں اپنی قسمت کی فال نکالا کرتی۔ سارے گیت میرے دل کے ترجمان تھے۔ رات گئے تک موسیقی سنا کرتی۔ کبھی موسیقی کی آواز میں فون کی آواز دب جاتی۔ کبھی امی پاس کھڑی چیخ چیخ کر مجھے متوجہ کرتیں!

میں انہیں کیا بتاتی کہ آج کل میں جس پھول کو دیکھوں، کھل اٹھتا ہے۔ جس ستارے پر نظر ٹکاؤں آنکھوں میں اتر آتا ہے۔

♥ ♡ ♡ ♥

ایک روز میں نے اس کے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے دیکھا، وہاں دو لڑکے کھیل رہے تھے۔ ایک بارہ سال کا ہو گا اور دوسرا نو سال کا۔

ایسے لگا جیسے میرے سینے کے اندر کوئی بم پھٹا ہے۔ آس پاس کی ہر شے گویا ریزہ ریزہ ہو گئی۔ نصیبوں جلی تو نے از خود یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ غیر شادی شدہ ہو گا!

اس کو بتانا چاہیے تھا!

اچھا! تجھے یہ کیسے یقین ہو گیا کہ وہ بھی تیرے عشق میں مبتلا ہے؟

خداوندا! سال کے 365 دنوں کی نگاہوں سے جڑی رفاقت میں، میں اتنا سرپٹ کیوں بھاگی کہ ٹھوکر کھائی۔

اس رات اذیت کے مارے میں سو نہ سکی، بار بار

اپنے آپ کو سرزنش کرتی اور کہتی! وہ تیرا کون ہے؟ وہ تیرا کیا لگتا ہے؟ اور تو دن رات کے ہر لمحے میں اسی کے بارے میں کیوں سوچے جاتی ہے؟ اس سوچ کا انجام تجھے معلوم ہے؟ تو اسے اپنی سانسوں سے بھی قریب رکھے ہوئے ہے۔ اپنے آپ کو سنبھال!

پھر' میں دل ہی دل میں عہد کرتی کہ اب اس کے بارے میں نہیں سوچوں گی۔ اس کا خیال تک ذہن میں نہ لاؤں گی' اس راستے سے بھی نہیں گزروں گی مگر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوتا کہ وہ تو سائے کی طرح میرے ساتھ ہے میں مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اس کی شبیہہ دھڑک رہی ہے میری سانسوں میں سے اسی کی خوشبو آرہی ہے۔ میں گھبرا کر کہتی۔

کیا یہ محبت ہے؟ کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟ انسان کو بے بس اور لاچار کردیتی ہے۔ کہیں یہ یک طرفہ آگ تو نہیں؟

اس کا گھر بار ہے' اور یہ بچے؟ آخر میں نے پہلے کیوں نہ سوچا!

کئی راتیں انگاروں پر لوٹتے گزریں میں کئی دن تک پارک میں نہ گئی اُفوہ! تب مجھے پتا چلا کہ میں تو آگ کی ڈگر پر روانہ ہو چکی ہوں۔ دل کہتا چل' وہیں پہ چل کسی پل چین نہ تھا۔

میں پھر وہاں پہنچ گئی مگر دل ہی دل میں گویا اس سے خفا بھی رہی۔ وہ سامنے گیٹ پر ہی جیسے میرا منتظر تھا۔ میں اسے دیکھے بنا سامنے سے گزر گئی۔ وہ دوڑتا ہوا میرے پیچھے آیا اور قریب آکر بولا۔

"آج کوئی ناراضگی ہے' چہرے پہ اتنا غصہ؟"

"دھڑ دھڑ دھڑ۔" اس کو قریب پا کے میرا دل پسلیوں سے باہر نکلنے لگا۔ نکل جا کم بخت اور اس کے قدموں تلے لوٹ پوٹ ہو کے مچلا جا۔

میری پلکوں کی منڈیریں بھیگ گئیں۔ میں بے بس ہو گئی تھی۔ میرا دل ضد کر رہا تھا کہ میں اس کی طرف دیکھوں' اس کی آنکھوں میں اپنا پیار دیکھوں اس کے ہونٹوں پر اپنی طلب کی مسکراہٹ دیکھوں اور پھر دیکھوں وہ صورت جو میرے کلیجے میں پھانس کی طرح آ ٹکی ہے۔ اپنے آپ کو باز رکھنا کتنا مشکل لگ رہا تھا۔

"بہت ناراضگی ہے آج! وجہ تو بتاؤ؟"

میں نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھائیں۔

"منانے کا موقع ہی دو!"

میں ہار گئی۔

"اس دن آپ کے گھر میں دو بچے کھیل رہے تھے۔" میں نے بمشکل گلے میں سے آواز نکالی۔

"میرے بیٹے ہیں۔" وہ لہجے میں باپ کا پیار سمو کر بولا۔ "آج کل ہاسٹل سے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے گاؤں میں میری امی' اباجی کے پاس چلے جاتے تھے۔ اس بار یہاں آگئے ہیں۔"

میں نے یہ صدمہ چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ (تم تم نے میرے علاوہ کسی اور سے شادی کی جرات کیسے کی) میں دانت پیستی رہی اور وہ آہستہ آہستہ کہتا رہا۔

"ہمارے ہاں رواج ہے۔ والدین بچپن میں ہی شادی کردیتے ہیں' اپنی مرضی کے مطابق۔ ابھی میں انیس برس کا تھا' میرے والدین نے میری شادی' پھوپھی زاد سے کردی۔ گاؤں کی ہے ان پڑھ ہے' پردہ کرتی ہے۔ میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی' ملک سے باہر بھی گیا۔ شوقیہ سرکاری نوکری کرتا ہوں۔ ہم لوگ زمیندار ہیں۔ چند سال پہلے میں نے یہاں گھر بنایا ہے جب سے میں اس گھر میں آیا ہوں' میری بیوی بیمار رہتی ہے۔ اس لیے دونوں بیٹوں کو ہاسٹل میں داخل کرادیا ہے۔"

وہ دھیرے دھیرے یوں بولتا رہا' جیسے اسے میرے چہرے کی شکن در شکن الجھن سے کوئی سروکار ہی نہیں بتاتا رہا اپنے شب و روز اپنے مشاغل جیسے کہ مری جا رہی ہوں اونہہ!

میں کوئی جواب دیے بغیر آگئی۔ میرا خیال تھا میں اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گی' اس کی صورت تک نہیں دیکھوں گی' رات کو تکیے میں منہ چھپا کر میں کتنی

دیر تک روتی بھی رہی تھی۔ پتا نہیں کیسے میں دوسرے دن وہاں پہنچ گئی۔ جہاں وہ کھڑا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ میرے دل کے اندر ڈھول بجا اور جیسے چاند چھلانگ لگا کر زمین پر آگیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو ہماری محبت کے لیے چنے گئے تھے' وہ کسی اور کے ہو چکے ہوتے ہیں؟ یا اللہ محبت کتنا ذلیل کرتی ہے!

اس کے ہونٹ کسی آگ میں جل رہے تھے' جیسے کہہ رہے ہوں میں نے جذبوں کی کمند ڈالی ہے۔ اجتناب کی فصلیں خواہ کتنی اونچی کرلو۔

وہ جیت گیا' اس کے خیال کو دل سے نکالنا میرے لیے ممکن نہ رہا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اب یوں ہونے لگا' جب اس کی بیوی گاؤں چلی جاتی' وہ مجھے اپنے پھولوں بھرے لان میں بلالیتا۔ اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر مجھے پلاتا۔ اپنے یورپ کے سفر کے قصے سناتا۔ اپنے پھولوں کے شوق کے بارے میں تفصیل سے بتاتا کہ اس لان میں ساری کاریگری اس کے ہاتھوں کی ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے اپنی کوئی پسندیدہ کیسٹ دیتا' جسے میں ساری رات سنا کرتی اور سوچا کرتی اگر موسیقی نہ ہوتی تو بنی نوع انسان کے انمول جذبے ان کہے رہ جاتے۔

محبت میں وقت کو پر لگ جاتے ہیں۔

ہمارے اوپر سے صدیاں اڑ اڑ کر گزرنے لگیں۔ رات کو اتنی گہری نیند آتی' جیسے کسی نے نشہ پلا دیا ہو۔ صبح آنکھ خوابوں کا خمار لے کر کھلتی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ محبوب کا تصور بھی شراب خانے کا کام کرتا ہے۔ میں سوچا کرتی' آخر ماہرین نفسیات بے خوابی کے مریضوں کو یہ مشورہ کیوں نہیں دیتے کہ وہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو جائیں! انہیں نیند کی گولی کھانے کی ضرورت نہیں رہے گی!

ایک دن جب میں اس کے لان میں بیٹھی تھی' اس کے ہاتھ سے کافی کی پیالی لے کر اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ کس قدر توانا تھے اس کے ہاتھ۔ صحت مند' سرخ اور مضبوط' بعض مردوں کی مردانگی ان کے ہاتھوں سے چھلکنے لگتی ہے۔ سلیقے سے کٹے ہوئے ناخن' بھری بھری انگلیاں جو خود اعتمادی کے ورق لگتی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اس کے ہاتھ دیکھ کر میرے دل میں ہلچل ہونے لگتی۔ وہ میرے دل میں اٹھتے طوفان سے بے خبر ملائمیت سے پوچھ رہا تھا۔

"تم نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"میرے بارے میں کچھ خاص ہو تو بتاؤں!"

"عام سہی' بتاؤ تو!"

میں نے اسے بتا دیا کہ دو سال پہلے جس کے ساتھ میرا نکاح ہوا تھا' وہ ملک سے باہر رہتا ہے۔ میرا اس کا ایک ایسا اختلاف پیدا ہو چکا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کیا۔ میرا خیال تھا میری طرح آج اس پر صدموں کا پہاڑ ٹوٹے گا اور وہ اپنی ساکھ برقرار نہ رکھ سکے گا اور پھر ٹوٹ ٹوٹ کر اور بکھر بکھر کر پوچھے "کیسے؟ کیوں!"

مگر وہ تو اطمینان کی مسند پر بیٹھا والہانہ پن سے مسکراتا رہا۔ جو لوگ دوسروں کے تن من میں آگ لگا دیتے ہیں' وہ خود کیوں اتنے پرسکون نظر آتے ہیں!

"دیکھو۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر اپنے قاتلانہ انداز میں بولا۔

"قدرت کے کام کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ جنہیں ہماری زندگی تلاش کرتی ہے' وہ کس موڑ پر آکر ملتے ہیں' تم سے ملنے کے بعد میں اکثر سوچا کرتا ہوں اگر ایک دن تم مجھے نظر نہ آجاتیں تو مجھے ساری عمر پتا نہ چلتا کہ میرے جنم کا مقصد کیا تھا۔"

میرے دل کا خون میرے چہرے پر آگیا۔

وہ بولا "اپنی تمنا کو مجسم دیکھ لینا بھی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ پتا نہیں تم کیا سوچتی ہو گی' مگر میں تو آج کل صرف تمہیں سوچا کرتا ہوں۔ احسان نہیں' ذہن کی عادت بن گئی ہے۔ کہاں آکے ملی ہو' کب آکے ملی ہو۔"

میں اس وقت بھول گئی کہ وہ شادی شدہ ہے' اس کے دو بچے ہیں اور یہاں اس کی بیوی رہتی ہے' جس گھر میں میں بیٹھی ہوئی ہوں۔

گھر آکر میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

”تو کیا چاہتی ہے؟“

”میں اسی کو چاہتی ہوں ہر قیمت پر۔“

”کیا سوتن بننا پسند کرے گی؟۔“

”ہاں! ہاں! اگر کوئی اور چارہ نہ ہوا تو۔“ خاموش محبتیں ہمیشہ قہر بن کر ٹوٹا کرتی ہیں۔ اگلے دن میں نے اپنی امی سے کہا۔

”امی! میں جواد سے چھٹکارا حاصل کر کے کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

امی نے میرا چہرہ غور سے دیکھا میرا چہرہ تو کئی دنوں سے دیکھ رہی تھیں اور شاید میرا چہرہ انہیں بہت کچھ بتا بھی چکا تھا۔

”سوچ لو۔“ انہوں نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

”سوچ لیا ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا ”اب اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق مجھے دیں۔“

♥ ♡ ♡ ♥

مزید 365 دن گزر گئے۔ گویا ہماری محبت کی کہانی 730 دن کی ہو گئی تھی۔ جیسے ہوا سے کتاب کے ورق الٹتے ہیں، اس طرح وقت اڑا چلا جا رہا تھا۔ 730 دنوں میں عشق جنوں کے راستے پر چل پڑا تھا۔ اس کا بھی، میرا بھی! جنوں کسی کا خیر خواہ نہیں ہوتا، اسی لیے تو عقل کا اس سے بیر ہوتا ہے۔

پھر ایک دن میں اس کے پھولوں بھرے لان میں بیٹھی تھی وہ بولا۔

”یوں کب تک؟۔“

میں نے نظر اٹھائی، اس کی نظریں بھٹکتی جا رہی تھیں۔

”کیا تم کوئی خاص امتحان لینا چاہتی ہو؟“

”آپ ہی بتائیں۔“ میں نے جلتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”آپ کی شادی ہو چکی ہے، میرا نکاح ہو چکا ہے۔ جب تک پہلے بندھن نہیں ٹوٹیں گے، نئے خواب کیسے پورے ہوں گے؟“

اس دن طے ہوا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔ بچے اپنے والدین کی تحویل میں دے دے گا اور میں نکاح فسخ ہونے کا دعویٰ کر دوں گی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اگلے دن میں نے اپنے وکیل کو بلایا اور اس سے کہا کہ میری طرف سے کاغذات تیار کر کے وہ جواد کو نوٹس بھیج دے۔

ان دنوں میں اکثر پاگل پن والی حرکتیں کیا کرتی۔ مثلاً ”یہ کہ ہر وقت دعائیں مانگا کرتی۔ اللہ کرے اس کی بیوی مر جائے، یہ کانٹا خود ہی نکل جائے۔ کوئی ایسا حادثہ ہو جائے کہ اس کی مجھ سے شادی ہو جائے۔

ایک ہفتہ تک وہ مجھے نظر نہ آیا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی شہر سے باہر جاتا تو مجھے بتا کر جاتا تھا۔ اس مرتبہ اچانک غائب ہوا، تو میں ویران سی ہو گئی۔ اپنی فضول فضول دعاؤں پر رنج سا ہونے لگا۔ جدائی میں محبت ہمیشہ وارفتہ ہو جاتی ہے۔ پل بھر مجھے چین نہ آتا۔ میرے لیے ساری دنیا خالی ہو گئی۔ ہر ایک سے الجھتی لڑتی پھرتی۔ بھلا ایک آدمی زندگی کے اوپر اس قدر حاوی کیوں ہو جاتا ہے کہ اس کے بنا ہر شے بے کار نظر آنے لگتی ہے!

آٹھ دن، جیسے مجھ پر آٹھ قیامتیں گزر گئیں۔

جب وہ نظر آیا تو میری نظر میں قہر تھا، دل میں غصہ تھا۔

وہ مجھے اپنے لان میں لے گیا، کافی بنا کر لایا اور میرا پھولا پھولا منہ دیکھ کر بولا۔

”میری بیوی شدید بیمار ہے، بیمار تو وہ عرصہ سے تھی۔ مگر یہاں تشخیص ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ ایک نئے ڈاکٹر سے پورے ٹیسٹ کروائے ہیں تو پتا چلا اسے کینسر ہے۔“ (اس وقت مجھے اللہ پر بہت پیار آیا۔ کتنی جلدی اس نے میری دعا سن لی تھی!)

”فوری علاج کے لیے اسے انگلینڈ بھیجنا ضروری ہو گیا تھا! وہاں میری چھوٹی بہن رہتی ہے، اسے اطلاع دی، انتظامات کرنے اور بیوی کو بھیجنے میں اتنے دن لگ گئے۔ تمہیں اطلاع بھی نہ دے سکا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میرا غصہ تو اس کی بیوی کی بیماری کا سنتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

”آپ ساتھ نہیں گئے، چلے جاتے۔“ میں نے بس یونہی اوپری دل سے کہا (اف محبت انسان کو کتنا

خود غرض بنا دیتی ہے)

”میرا چھوٹا بھائی ساتھ گیا ہے، میں نے چھٹی لینی ہے، کچھ اور انتظامات کرنے ہیں آپریشن کے وقت چلا جاؤں گا۔“

میرے دل کو جیسے قرار سا آ گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ایک دن جب بارش ابھی ابھی ہو کے رکی تھی اور زمین کے سینے سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی، قطروں کے ہار پہنے سارے پھول اور پودے مسکرا رہے تھے، آسمان کا رنگ سنہری ہو رہا تھا، ہم دونوں پارک سے نکل کر اس کے گھر میں آ گئے۔ اب تو روز طویل ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ چونکہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی، وہ مجھے اندر اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔

اس کا بیڈ روم میرے ہر خواب سے حسین تھا۔ سلیقہ، ذوق لطیف، فرنیچر کا انتخاب، روشنیوں کا قرینہ، اندر کیا نہیں تھا۔ اس نے ہماری پسندیدہ کیسٹ لگا دی۔ میں ابھی تک کھڑی ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کافی بنانے لگا۔ میرے دل میں جلن ہونے لگی، یہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہو گا۔

اس نے کافی بنا کر میرے ہاتھ میں تھمائی اور کہنے لگا۔

”یہ صرف میرا بیڈ روم ہے۔ میری بیوی کا کمرہ علیحدہ ہے، میں اس کمرے میں سارا وقت اپنی مرضی سے گزارتا ہوں۔“

”تنہائی محسوس نہیں کرتے؟۔“ اندر سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

”اب نہیں!“ اس نے آنکھوں میں مستی چھپا کر کہا۔

میں صوفے پر بیٹھنے لگی تو اس نے ہاتھ سے مجھے روک دیا۔ بولا ”یہاں بیٹھو، میرے بیڈ پر عرصہ سے تمنا تھی، تمہیں یہاں بیٹھے ہوئے دیکھوں۔“ میں مسکرا کر بیٹھ گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں اس کے اختیار میں ہوں اور وہ مجھے مسمرائز کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

وہ اپنے اسی جان لیوا لہجے میں دھیرے دھیرے بولنے لگا۔ ”میں اکثر سوچتا ہوں، محبت عجیب چیز ہے۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ جب میرے دو بچے ہو جائیں گے تو میں زندگی کے آگے ہتھیار ڈال دوں گا، تب مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو جائے گی اور محبت بھی ایسی۔“ وہ تھوڑا سا رکا۔ ”قصے کہانیوں والی کہ اسے پائے بنا جیا نہ جائے اب ہمہ وقت سوچتا ہوں اس کو کیسے حاصل کروں؟ کیسے پاؤں اسے، کیسے اپناؤں اسے؟“

اس نے پہلی مرتبہ میرا ہاتھ تھام لیا۔

اف! میں تو صدیوں سے اس خواہش میں جل رہی تھی۔ میرے اندر بھڑ بھڑ شعلے جاگے۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا، میں جذبوں کی یلغار سے لرز رہی تھی، بلکہ کانپ رہی تھی۔ وہ جب میرے قریب کھڑا ہوا تو اس کے دل کے زور زور سے دھڑکنے کی صدائیں اپنے کانوں سے سن رہی تھی، شاید میرا دل بھی اتنے ہی زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میرے ہونٹ لرز رہے تھے۔ ہم دونوں جذبات کے پل صراط پر پہنچ گئے تھے مگر مجھے بخوبی احساس تھا کہ یہ پل صراط ہے، سانس بھی زور سے لی تو میں گر جاؤں گی، اس لیے میں نے پل صراط پر اپنا پاؤں احتیاط سے رکھا۔

مجھے اس کی صورت سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا حال بھی میرے جیسا ہے۔ بس دل یوں چاہ رہا تھا، کوئی جادوئی تخت آئے اور ہم دونوں کو اسی حالت میں اڑا کر دنیا سے دور کسی الف لیلوی جزیرے میں چھوڑ دے۔ بس وہاں کوئی نہ ہو ہمارے سوا۔

”تم نے میرا بہت امتحان لیا ہے، اور کتنا امتحان لو گی؟۔“

میں اس کی سانسوں کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ میں نے خوف زدہ نظروں کو سوال بنایا، وہ بولا۔

”میں سمجھ گیا ہوں۔ تم ایک روایتی لڑکی ہو اور تم مجھ سے باقاعدہ شادی کرنا چاہتی ہو۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں، اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ مگر اب جو اس کی بیماری آڑے آئی ہے۔ ٹھیک بھی ہو سکتی ہے، مر

بھی سکتی ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہو کر آ گئی تو بھی میں اسے طلاق نہ دے سکوں گا۔ سارا خاندان تھو تھو کرے گا کہ میں نے ایک بیمار عورت کو ٹھکرا دیا اور اس کی زندگی کتنی ہے' یہ تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا ہم اس وقت مجھے سہارا دو!"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے لرزتے ہوئے کہا۔

"آپ انتظار کریں۔"

"انتظار؟" اس نے زور سے کہا۔ "کتنے سال؟ میں دو سال سے ـــــ آگ میں جل رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے تم بھی جل رہی ہو' ہم ان بکھیڑوں میں کیوں پڑیں۔ تم نکاح فسخ کرواؤ' میں طلاق دوں' بڑے واہیات مرحلے ہیں' کیوں نہ تیسری راہ تلاش کی جائے؟"

"تیسری راہ؟" میں نے جیسے خواب میں پوچھا۔

"جس طرح کسی موڑ پر اچانک محبت زندگی میں داخل ہو جاتی ہے' یہ دیکھے بنا کہ دوبارہ زندگی شروع کرنے کی مہلت ہے یا نہیں اسی طرح محبت ایک تیسرا راستہ تلاش کرتی ہے۔"

"جی..... جی!" میں اپنا ہاتھ چھڑا کر ایک طرف سمٹ گئی۔

"سنو عنبرین! شادی دو انسانوں کے درمیان ایک سمجھوتا ہے' ایک معاہدہ ہے۔" وہ میری طرف بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وہ سرخی اتر آئی جو خالص ہوتی ہے۔ میں نے پہلی بار شعلوں کی لپک میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ دھیرے دھیرے میری طرف آیا۔ دو سالہ محبت عقل سے ماورا ہو گئی۔ یہی کچھ تو میرے خوابوں میں رہتا تھا۔ اس نے سرگوشی میں اپنی بات جاری رکھی۔

"اسی طرح محبت دو دلوں کے درمیان ایک معاہدہ ہے' ایک سمجھوتا ہے۔" (میرے کنوارے ارمان مجھے تپتے ہوئے تنور کے کنارے لے گئے اس کا ہو جانا' اس کے بازوؤں میں سما جانا' محبت جو کچھ سوچتی ہے' بیان میں نہیں آسکتا) وہ بولا۔

"فرق صرف اتنا ہے کہ محبت کے معاہدے کے لیے کسی قاضی' کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک دل قاضی بن جاتا ہے اور دوسرا گواہ۔ سنو جانم! انگلینڈ سے آنے کے بعد میں اپنی بیوی کو گاؤں بھیج دوں گا۔ وہ مستقل وہیں رہے گی اور تم یہاں میرے اس کمرے میں' میرے دل میں۔"

وہ قریب ہوا۔ میں دور ہٹ گئی۔

"پھر جب حالات ہمارے حق میں ہوئے' شادی بھی کر لیں گے کیوں دوری کی سزا کاٹیں؟ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ دنیا بھر میں ایسے بندوبست ہوتے ہیں۔ تم اتنی تعلیم یافتہ ہو کے اتنی روایتی نہ بنو۔"

روایتی؟ میں نے تو روایات سے اور اپنی عادات سے بغاوت کی تھی۔ اس ستم گر کے لیے جو میرے دل کی آخری تمنا بنا میرے سامنے کھڑا تھا۔ میری ایک ہاں جسے پاگل پن کی حدود میں داخل کرنے کو کافی تھی اور جس کے' میں نے اپنے عشق میں دیوانہ بن جانے کی تمنا کی تھی۔

وہ ذرا آگے بڑھا' میں ذرا پیچھے ہٹی۔ اف توبہ! محبت کی ڈیمانڈ کس قدر خطرناک ہوتی ہے' کسی مذہب' کسی قدغن کو خاطر میں نہیں لاتی موم آگ کے نزدیک آتی جا رہی تھی۔

عین اسی وقت کسی کونے کھدرے میں بیٹھی ہوئی روایتی عورت نے نکل کر میرے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ سجا سجایا کمرہ گول گول گھومنے لگا۔ ہر عورت کے اندر ایک روایتی عورت ہوتی ہے' ایک باغی عورت ہوتی ہے' عام طور پر روایتی عورت جیت جاتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم' میں کیسے اس کمرے سے باہر آئی' جس کمرے میں میری جنت تھی۔ پھر الٹے پاؤں بھاگی۔ سڑک پر بھاگتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا' نیویارک جیسی بلند و بالا عمارتیں دھڑ دھڑ' میرے اوپر گر رہی ہیں۔ میں باقاعدہ ان کے گرنے کے دھماکے سن رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ جیسے سارا ملبا میرے اوپر گر رہا ہے۔ پتا نہیں گھر کیسے پہنچی' بستر پر اوندھی گری اور بے ہوش ہو گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ہوش آیا تو تیز بخار تھا۔ امی سرہانے بیٹھی تھیں۔

ڈاکٹر انجکشن لگا رہا تھا ہذیان اور خفقان میں بخار ایسا بگڑا کہ ٹائیفائڈ بن گیا' یوں پورا مہینہ قدرت نے مجھے ماہ حزن منانے کو دے دیا۔

ذرا ٹھیک ہوئی تو امی نے بتایا۔ ایک آدمی کا دو تین بار فون آ چکا ہے مجھے پھر لرزہ ہونے لگا۔ تپ چڑھنے لگا۔ اسی رات اس کا فون آ گیا۔

"تمہاری امی نے بتایا' تمہیں بخار ہے' اب کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہو جاؤں گی۔" میرا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"میں انگلینڈ جا رہا ہوں' شاید ایک ماہ وہاں رہنا پڑے' تمہاری بیماری کی وجہ سے تم سے ملے بنا جانا پڑ رہا ہے۔"

میں نے فون رکھ دیا۔

مائیں بڑی سیانی ہوتی ہیں' امی میرے چہرے کو مسلسل دیکھا کرتیں' اس وقت چاند پھوٹتے بھی دیکھا کرتی تھیں' اب گرہن میں قید بھی دیکھ رہی تھیں۔

ایک دن کہنے لگیں۔

"بیٹا! اپنے آپ کو سنبھالو۔ احساس میں اتنی شدت اچھی نہیں ہوتی۔ یاد ہے جواد سے لڑائی کے بعد بھی تم اتنی ہی بیمار ہو گئی تھیں۔"

ایک مہینے کی بیماری نے مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیا' جس نے مجھے ساتویں آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ نہ آنکھوں میں وہ ستارے رہے' نہ گالوں پہ گلاب رہے' نہ ہونٹوں میں رس رہا' نہ زلفوں میں کس بل رہے' اف کس قدر فانی چیز ہے یہ حسن ایک صدمہ ایک بیماری' چہرہ بدل کے رکھ دیتی ہے۔

ایک بار آسمان سے گر کر کوئی زمین سے اٹھ نہیں سکتا۔ گہرے سمندروں میں ڈوب جانے والوں کی لاشیں بھی نہیں ملتیں۔ اگر پرندہ بہت بلندی سے گرے تو اس کے پر ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرا وجدان بڑی رفعتوں سے نیچے گرا تھا۔ یہ ہوا کیسے کہ اس نے مجھے درجہ دوئم کی لڑکی سمجھ لیا۔ میں اب جب بھی اس کے بارے میں سوچتی' دھڑ دھڑ کر کے عمارتیں مجھ پر گرنے لگتیں' دروازے' کھڑکیاں ٹوٹنے لگتے' خاک اڑنے لگتی۔ میرے آس پاس ملبے کا ڈھیر لگ جاتا۔

میں بستر پر لیٹی درد میں ڈوبے گیت سنتی رہتی اور روتی رہتی اور پہلے سے زیادہ حیران ہوتی کہ غم میں ڈوبا ہر گیت میرے جذبات کی ترجمانی کرنے لگتا۔ کیا واقعی ان شاعروں کے دل کو چوٹ لگتی ہے یا ان پر انسانی جذبوں کے الہام اترتے ہیں۔ کتنی خوب صورتی سے درد و اندوہ کی کیفیت کو بیان کر جاتے ہیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

بہت دنوں بعد موسم کچھ بدلا تھا۔ میں نے کپڑے بدل کر اپنی آنکھوں کے سیاہ حلقوں کو آئینے میں دیکھا اور باہر صحن میں جا کر لیٹ گئی۔ اسی لمحے ایک مرد سوٹ کیس اٹھائے گھر میں داخل ہوا۔

ہاں! وہ جواد تھا۔ امی اسے دیکھ کر حیران اور پھر پریشان ہو گئیں۔

"بیٹا! تم اس طرح اچانک آ گئے نہ خبر نہ اطلاع۔؟"

"کیا کرتا۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "ان کے نوٹس نے یوں اچانک آنے پر مجبور کر دیا۔"

وہ امی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے سلیپر پہنے اور اٹھ کر اندر آ گئی۔ ایک بے کلی میرے ساتھ ہی آ گئی۔ وہ کافی دیر بیٹھا امی سے باتیں کرتا رہا۔ امی کو وہ پسند بھی بہت تھا۔ امی اس کی آؤ بھگت میں لگ گئیں۔

پھر وہ میرے کمرے میں آیا' بولا۔

"تم بہت کمزور ہو گئی ہو' امی نے بتایا کہ تمہیں ٹائیفائڈ ہو گیا تھا" رکا ہنسا اور پھر بولا "اتنا غصہ دل میں نہ رکھا کرو کہ بخار سے نکالنا پڑے!"

میں آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی رہی۔

اس نے میز پر سوٹ کیس رکھ دیا اور اس کے ساتھ چابی بھی رکھ دی۔

"میں کچھ چیزیں تمہارے لیے لایا تھا۔ ایئرپورٹ سے سیدھا ادھر آ گیا ہوں۔ اب امی ابا کے پاس جاؤں گا۔ ان کو بھی اطلاع نہیں دے سکا۔ دو چار دن بعد پھر چکر لگاؤں گا۔ اب تم ٹھیک ہو جاؤ!"

اس کے جانے کے بعد امی اندر آئیں' انہوں نے چابی لے کر سوٹ کیس کھول دیا۔ اس میں وہ ساری چیزیں تھیں جو ایک شوہر اپنی بیوی کے لیے لا سکتا

ہے۔ کپڑے ' زیور ' جوتے ' پرس ' میک اپ کا سامان ' پرفیوم ' ڈیکوریشن پیس میں بے دلی سے دیکھتی رہی۔ امی ایک ایک چیز کی تعریف کرتی رہیں۔ پھر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ ماتھے پر سے میرے بال ہٹائے اور ماؤں والے سلیقے سے گویا ہوئیں۔

"جواد کہہ رہا تھا ' اگر عنبرین کی یہی شرط ہے کہ میں ملازمت چھوڑ کر پاکستان آجاؤں تو میں آنے کو تیار ہوں۔"

تین سال پہلے جب میں نے ایم اے کرلیا تھا ' میرا نکاح ہو گیا تھا۔ جواد سویڈن میں رہتا تھا۔ ایک غیر ملکی ایئرلائن میں ملازم تھا۔ تنخواہ بہت اچھی تھی۔ اس نے اخبار میں شادی کے لیے اشتہار دیا تھا۔ میرے ماموں نے اس کا اتا پتا لگایا اور رشتہ اوکے کر دیا۔ جواد کو بلایا گیا ' اور میرا نکاح ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اشتہاری شادیوں میں گھپلا ضرور ہو جاتا ہے۔ چھ ماہ ہی گزرے تھے ' ان کے رشتہ داروں نے گمنام خط لکھنے شروع کر دیے کہ اس نے سویڈن میں شادی کی تھی۔ ایک بچی تھی ' اس عورت کو طلاق دے چکا ہے۔

جب میں نے گھر میں اس فراڈ کا بھانڈا پھوڑا تو امی نے اور ماموں جان نے مجھے بہت آہستگی سے سمجھایا کہ "اس نے ہم سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ ہم نے تمہیں نہیں بتایا تھا۔ خیال تھا ' رخصتی کے وقت بتا دیں گے۔"

"کیوں؟ کیوں آخر۔؟"

میں ہتھے سے اکھڑ گئی۔ گھر والے سمجھا بجھا کر تھک گئے۔ جواد نے فون پر بات کرنے کی کوشش کی۔ خطوط میں معافیاں مانگیں مگر میری طرف سے ایک انکار۔

"آپ نے اپنے ملک میں بھی کوئی آدمی نہیں ڈھونڈا اور دوسرے ملک سے ایک ایسا آدمی میرے مقدر میں لکھ دیا ' جو شادی رچا چکا ہے ' محبت کا زمانہ گزار چکا ہے۔"

میں نے ضد میں آ کے نوکری کر لی ' پھر کیا ہوا میرے دل میں ایک ایسا آدمی آ بیٹھا جس کی پہلی بیوی بھی تھی اور دو بچے بھی! میں اس کی بیوی کے ہوتے ہوئے اس سے شادی کرنے پر رضامند تھی ' اس کے دونوں بچوں کی ماں بننے پر تیار تھی!"

یہ کیسے ہو گیا؟ واہ محبت کا کیا کمال ہے؟ ہاں! محبت ہی کا اعجاز ہے۔ صورت بدل دیتی ہے ' اصول بدل دیتی ہے ' جہاں بدل دیتی ہے ' حالات بدل دیتی ہے ' زاویہ نگاہ بدل دیتی ہے ' اور تو اور ساری زندگی کا فلسفہ بدل دیتی ہے!

میں نے جواد سے کہا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے اپنے ساتھ لے جائے۔ حیران تو امی بھی تھیں اور سب گھر والے بھی ' جبکہ میں نے شرط ہی ایسی رکھ دی تھی۔ میں نے کہا تھا ' جواد جس رات کی سیٹیں کنفرم کروائے گا ' اس روز شام کو سادگی سے میری رخصتی ہو جائے گی۔ میں باقاعدہ دلہن نہیں بنوں گی ' گھر سے رخصت ہو کر جہاز میں آ بیٹھوں گی میری ضدی طبیعت سے سب ہی واقف تھے ' انہوں نے ایسا ہی بندوبست کر دیا۔ اصل میں ' میں ایک ماہ ختم ہونے سے پہلے یہ شہر ' یہ ملک چھوڑ جانا چاہتی تھی۔

ایئرپورٹ پر سب مجھے چھوڑنے آئے۔ میرے کپڑے سفید تھے۔ بس میری کلائیوں میں سونے کی نئی چوڑیاں تھیں ' جو امی نے اپنے ہاتھ سے مجھے پہنائی تھیں۔ جب میں جہاز کی طرف جانے لگی تو امی نے مجھے سینے سے لپٹا لیا اور مجھے بھینچ بھینچ کر خوب روئیں سسک سسک کر روئیں چیخ چیخ کر روئیں ' میں پتھر کی طرح چپ رہی میری آنکھ کے آنسو کچھ عرصہ پہلے ختم ہو گئے تھے۔

اور اب تو دل سے میں اپنا بدلہ لے رہی تھی...... مجھے تو آنکھ کا کفارہ ادا کرنا تھا۔

"بیٹی خوش رہنے کی کوشش کرنا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔" امی نے ماتھا چوم کر دعا دی۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ اپنے آپ کو مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی اور جا کے جہاز میں بیٹھ گئی۔

جب جہاز نے پرواز کی تو جواد نے میرا چہرہ غور سے دیکھ کر کہا۔ "تم شاید تھک گئی ہو ' میں کسی خالی سیٹ پر جا بیٹھتا ہوں ' تم یہاں سو جاؤ آرام کرو۔"

"نہیں!" میں نے پرس کھولا۔ "اصل میں مجھے

اپنی دوا بھی کھانی ہے ' پہلے کھانا کھاؤں گی پھر دوا کھا کے سو جاؤں گی۔" یہ دوا وہ نیند کی گولی تھی جس نے ایک ماہ سے مجھے سکون میں رکھا ہوا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

سویڈن پہنچ گئی۔ جواد کا ایک چھوٹا سا بکھرا ہوا گھر تھا۔ میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی ' وہ میرے لیے چائے بنا کر لایا اور بڑے مہربان لہجے میں بولا۔

"بینا! میں برا آدمی نہیں ہوں ' اتنی محبت سے تمہیں بیاہ کر لایا ہوں ' تمہیں دنیا کا ہر آرام دینے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔

"جواد! میں اپنی رضا سے تمہارے ساتھ آئی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کروں گی مگر تم بھی ایک وعدہ کرو۔"

"کیا؟"

"میں بڑی موڈی لڑکی ہوں ' اسی لیے مجھے شادی سے خوف آتا تھا۔ مجھ پر عجیب و غریب موڈ گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی میرا دل پاتال میں اتر جاتا ہے۔ میں گم صم ہو جاتی ہوں ' اپنے آپ سے بھی بے گانہ ہو جاتی ہوں بس جب مجھ پر ایسا عالم گزرے ' تم ان دنوں مجھے کچھ نہ کہنا میرے وجود کو چھونا تک نہیں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا کرنا ' دو چار دن کے بعد میں خود ٹھیک ہو جاتی ہوں۔ باقی رہی گھرداری ' میں اس سے کبھی غافل نہیں رہوں گی۔ اپنا ہر فرض ادا کرتی رہوں گی۔"

جواد نے اپنا وعدہ نبھایا اور میں نے اپنا۔

میں نے زندگی کی ساری خوب صورتیاں اس کے گھر میں بھر دیں۔ وہ بڑا ملنسار آدمی تھا۔ اس کے ملکی و غیر ملکی سینکڑوں دوست تھے۔ ہمارے گھر میں دعوتوں ' پارٹیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے سارے دوست ہمیں ایک "آئیڈیل کپل" کہتے تھے۔ میں کام کرتے تھکتی نہ تھی۔ خود کو ہمیشہ مصروف رکھتی۔ ہر ویک اینڈ پر ہمارے ہاں میلہ سا لگ جاتا۔ میری میزبانی اور خانہ داری کے چرچے تھے۔ میں اپنے ذہن کی یورش سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو جسمانی طور پر مصروف رکھتی۔ زندگی کا یہ رخ میرے لیے بالکل نیا اور حیرت انگیز تھا۔

سال بعد ' میرا بیٹا پیدا ہو گیا۔ اس کو بازوؤں میں لیتے ہی میں غم جاناں اور غم دوراں سے بے نیاز ہو گئی۔ میں اکثر سوچا کرتی کہ بچہ قدرت کا انمول انعام ہی نہیں ایک نادر سمجھوتا بھی ہے ' اپنے آپ سے اپنے حالات سے عشق کی ساری رسمیں اس پر سے قربان کی جا سکتی ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کا نام نادر رکھ دیا۔ زندگی اربوں کھربوں لوگوں کے طرز پر گزرنے لگی۔

گاہے بہ گاہے میرے چپ کے قفل کو توڑنے کے لیے جواد کہہ دیتا۔

"یار! کبھی تو بیویوں کی طرح مجھ سے جھگڑا کیا کرو۔ ہر بات پہ اچھا کہہ دیتی ہو ' ہر بھول کو ہنس کر ٹال دیتی ہو۔"

"میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گی۔"

"نہیں جاناں! شوہر چاہتا ہے کہ بیوی لڑ جھگڑ کر اپنا استحقاق منوائے۔ کبھی کبھی اس پر شک کرے ' روئے پیٹے ' ازدواجی زندگی کو یہ باتیں منجمد نہیں ہونے دیتیں۔"

میں کہتی۔

"جب تم مجھ سے اکتا جاتے ہو تو باہر چلے جایا کرو۔ کچھ اچھا وقت دوسری عورتوں کے ساتھ گزار لیا کرو۔"

"گدھی!" وہ غصے سے دانت پیستا۔ "میں ایسا ضرور کرتا اگر تم ایک جھگڑالو اور شکی بیوی ہوتیں۔ اس گھر کو تم نے جنت کا ٹکڑا بنا رکھا ہے۔ میرے منہ سے فرمائش نکلتی ہے اور تم بوتل کے جن کی طرح لے کر حاضر ہو جاتی ہو۔"

"شاید تمہیں یہ سکون کاٹنے لگا ہے۔" میں ہنس کر کہتی۔ وہ قہقہہ لگاتا۔

کبھی چپ مرد کو توڑ دیتی ہے ' کبھی مروڑ دیتی ہے ' اکثر مرد بیویوں کی بک بک سے تنگ آئے ہوتے ہیں۔ بہت سی ازدواجی الجھنیں ہمارے گھر میں تصفیہ کے لیے آنے لگیں۔ سویڈن جیسے ملک میں جہاں حسن اور فراوانی ہے ' مگر خودکشی کی شرح ساری دنیا سے

زیادہ ہے۔ وہاں ہماری زندگی اردگرد کے لوگوں کے لیے قابل رشک تھی۔ لوگ اس کا راز جاننے کے لیے آیا کرتے۔

میں انہیں کیا بتاتی کہ رشک بھری زندگیوں میں ایک ساتھی ہمیشہ پاتال میں اتر جاتا ہے۔

. ☆ .. ☆ .*

ایک دن جب ہمارے شہر میں نئی نویلی دھوپ نکلی تھی اور میں جواد کو ناشتہ کرا رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”بینا! ان چھٹیوں میں جنت میرے گھر آنا چاہتی ہے۔“

میرے اوپر پھر زور زور سے ملبا گرنے لگا۔ خاک اڑنے لگی۔ شیشے ٹوٹنے لگے‘ فلک بوس عمارات زمیں بوس ہونے لگیں۔

جنت‘ جواد کی سویڈش بیوی سے تھی۔ میں جانتی تھی‘ مگر ہمارے درمیان اس کا ذکر کبھی نہیں آیا تھا۔

میں کرسی سے اٹھ گئی‘ وقت دیکھا‘ نادر کے لیے ناشتہ بنایا‘ پھر اسے اٹھایا‘ منہ ہاتھ دھلا کر اسے ناشتے کی میز پر لے آئی۔

اس دوران جواد‘ نادر سے کھیلتا رہا۔ میں گم صم رہی۔ جواد کو میرے رد عمل کا اندازہ تھا۔

کھانے کی میز صاف کرنے کے بعد میں نے نادر کو اس کی نرسری میں چھوڑا اور ایک پل جواد کے پاس ٹھہر کر بولی۔

”جنت کو لے آو‘ اگر اسے ہمارے ساتھ رہنا پسند ہو تو یہیں رہنے دو۔“

جواد پر شادیٔ مرگ طاری ہو گئی۔ اس نے کتنی دیر تک مجھے بے یقین سی نظروں سے دیکھا‘ یہ وہ بات ہے کسی زمانے میں جس سے میں شدید نفرت کرتی تھی۔ دوسرے کی اولاد کو پالنا۔ لیکن اب میں نے اپنے آپ کو گھسیٹ کر ملبے میں سے نکالا‘ دل کی ایک خوشی کے چھن جانے کے عوض میں نے سوچ لیا۔ اپنے قریب رہنے والے ہر فرد کو وہ خوشی مہیا کردوں گی‘ جو اس کے دل میں ہے۔

جواد نے مجھے بتایا کہ پہلے تو جنت اپنی ماں کے پاس چلی جایا کرتی تھی مگر اب اس کی ماں نے بھی شادی کر لی ہے اور وہ میرے پاس آنے کے لیے ضد کر رہی ہے۔

جنت‘ جسے ہم سب پیار سے جینی کہتے ہیں‘ ہمارے گھر آگئی۔ وہ ایک انتہائی مہذب اور پیار کرنے والی بچی تھی۔

میں نے اسے ماں والا پیار دیا۔ شاید خالی دل کا ایک کونا بھرنا چاہتی تھی۔۔۔ وہ ہمارے ماحول میں رچ بس گئی۔ اس نے مجھ سے اردو سیکھنا شروع کر دی۔ نادر کی دیکھا دیکھی‘ مجھے امی اور جواد کو ابو کہنے لگی۔ کرتا شلوار پہننے میں فخر محسوس کرنے لگی۔

کبھی کبھی وہ میری اجازت سے اپنی ماں کو ٹیلیفون کر لیا کرتی تھی۔

ایک دن میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

”امی جان‘ کیا ساری پاکستانی مائیں آپ جیسی ہوتی ہیں؟“

”کیوں کیا بات ہے جینی؟۔“ میں نے اس کا ماتھا چوما‘ (ہاں‘ پاکستانی مائیں ملبے تلے جو رہتی ہیں!)

کہنے لگی۔ ”میں نے فون پر اپنی ماما سے آپ کی تعریف کی تھی تو وہ کہنے لگیں‘ ایشیائی مائیں ایموشنل ہوتی ہیں۔ اس لیے بچوں سے بہت لاڈ کرتی ہیں۔“

(ایموشنز کے سوا ایشیائی ماؤں کے پاس ہوتا کیا ہے‘ کبھی تو انہیں ٹھیس لگتی ہے تو ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں!)

میرے ساتھ رہتے رہتے‘ جینی نے میری عادات اپنانا شروع کر دیں۔ ہم نے اسے نزدیک والے کمیونٹی اسکول میں داخل کرا دیا۔ گھر آکر وہ میرے چھوٹے چھوٹے کام کرنے لگتی۔ نادر کے سارے معاملے اس نے سنبھال لیے تھے۔ تب میں اور جینی ایک کمرے میں رہنے لگے۔ جواد اور نادر کو دوسرا کمرہ دے دیا تھا۔

جینی نے ہاتھ بٹانا شروع کیا تو میں نے بھی جاب کر لی۔ گھر میں اور بھی خوشحالی آگئی۔ ابھی ہم نے اطمینان کا سانس ہی لیا تھا کہ پاکستان سے امی جان کی وفات کی خبر آگئی۔ میں اپنی امی کو ہر مہینے فون کرتی تھی۔ نادر کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھیں اور جنت کے آجانے سے انہوں نے مجھے بہت دعائیں دی تھیں۔ اب انہیں یقین آگیا تھا کہ میں نے خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔

اس جب سے میں نے جاب کی تھی‘ انہیں باقاعدہ فون نہ کر سکی تھی۔ یوں پانچ سال بعد اچانک پاکستان آنا پڑا۔

. ☆ .. ☆ .*

وقت کتنی بڑی حقیقت ہے اور ظالم بھی۔ میں پارک میں چکر لگا کر ایک طرف بیٹھ گئی اور یہ دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ میں اس کے گیٹ کے آگے سے بے خیالی میں گزر آئی ہوں۔ نظر اٹھا کر بھی اس طرف نہیں دیکھا۔ یہی وہ گیٹ ہے‘ جس کے آگے سے گزرتے ہوئے میرا دل ایک بیٹ مس کیا کرتا تھا۔ اس گھر کو دور سے دیکھ لینا میری بصارت کی معراج تھی۔ کئی بار بے تحاشا مصروفیات میں سے نکل کر دوڑی دوڑی آتی اور دور سے گیٹ کو دیکھ کر بھاگ جاتی۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ مجنوں لیلیٰ کے کتے سے کیوں پیار کرتا تھا۔ اسی کی نسبت سے مجھے یہ پارک جنت کا تختہ لگتا تھا۔ ہر شے میں نیرنگی اور موسیقیت رچی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اب ہر طرف ایک عام سا منظر تھا۔ کسی چیز میں کوئی خاصیت نہ تھی۔ نہ پھول پودے خمار آلود تھے‘ نہ ہوائیں‘ اٹھلا اٹھلا کر چل رہی تھیں۔

پتا نہیں کس وقت جواد آکر میرے پاس بیٹھ گئے۔ میرا چہرہ دیکھ کر بولے۔

”تم تو پاتال میں اتری لگتی ہو‘ کیا بات ہے؟۔“

میں نے دیکھا‘ نادر جھیل کنارے بھاگ رہا تھا اور جینی اسے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”دوڑیں دوڑیں‘ وہ دیکھیں دونوں بچے گر جائیں گے!“

جواد بچوں کی طرف لپکے‘ میں نے دور سے اس کے گیٹ کو دیکھا‘ لان کے اندر دیکھا‘ ہر جگہ اداسی اور اندھیرے نظر آئے۔ گھر بھی اجڑا اجڑا سا دکھائی دیا‘ پھول بھی کہیں نہ تھے۔

پتا نہیں وہ کہاں ہو گا۔ اس کی بیوی زندہ ہو گی یا مر گئی ہو گی۔ کیا پتا اس نے دوسری شادی کر لی ہو‘ ممکن ہے اس کے بال سفید ہو گئے ہوں۔ وہ اپنے پراسرار سراپا کے ساتھ اپنے خوب صورت کمرے میں بیٹھا کوئی دھن سن رہا ہو۔

یہ دل کے معاملے بھی نرالے ہوتے ہیں۔ دل سات منزلوں سے کودنے پر آمادہ رہتا ہے‘ زہر بھی تریاق لگتا ہے‘ مگر ایک ننھی سی پھانس کلیجے میں چبھ جائے تو زندگی بھر نکل نہیں سکتی‘ دکھتی رہتی ہے‘ محبت کا جرم‘ وصال کی آرزو ہے۔

عورت مکمل خواب دیکھتی ہے۔ جنم سے مرن تک‘ وہ جانتی ہے محبت کا چہرہ سدا ایک جیسا نہیں رہتا۔ ابھرتا‘ ڈوبتا‘ بنتا‘ بگڑتا رہتا ہے۔ اس منصوبے کی اس قدم قدم پر سزا ملتی ہے۔ پھر بھی وہ محبت کا ایک الگ سا جہاں لیے بیٹھی ہوتی ہے۔ اس کے لیے وہ تیاگ کرتی ہے‘ مگر گناہ کی وادی میں قدم نہیں رکھتی۔

محبت تو اسے بھی مجھ سے تھی‘ کبھی تو وہ ہر چودھویں چاند کو میلوں کا سفر طے کر کے بھی اس پھولوں بھرے کنج میں آکے کھڑا ہو جاتا تھا‘ جہاں میں اسے چاند کا سایا سمجھ کر ایک نظر دیکھتی اور چلی جاتی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کی تمنا‘ شدت سے دل میں اٹھی یوں‘ جیسے میں ملبے کے ڈھیر پہ بیٹھی ہوں اور دونوں ہاتھوں سے مٹی کھود کھود کر اپنی کوئی قیمتی شے تلاش کر رہی ہوں وہ تو ایک تمنا ہی تھی‘ جو لاوے کی طرح پھٹی اور بھونچال بن کر حواس پہ چھا گئی۔

دوڑ کر جاؤں‘ گیٹ کو دھکا دے کر کھولوں‘ لان کو پھلانگتی پھلانگتی اس کمرے کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر کھول دوں۔ نیم تاریک کمرے میں اس کا منور چہرہ دیکھوں ایسے‘ جیسے وہ آسن جمائے دل کی اندھیاری کوٹھری میں براجمان ہے!

شدت جذبات سے لرزتی ہوئی میں کھڑی ہو گئی۔ جواد دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے ادھر ہی آرہے تھے۔ میں نے لپک کر نادر کو اٹھا لیا۔ سینے کے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ اس کا منہ چوما۔ (بیٹا میرے دل کو سہارا دو)

اور پھر پانچ صدیوں سے رکے ہوئے آنسو‘ سسکیاں ہچکیاں امی کے نام پر لگا دیں۔